تصوّف کی حقیقت و اہمیّت

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم :

سورہ ذاریٰت کی آیت ۵۶ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن و انس کو محض عبادت اور بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ بندگی اور عبادت کا کیا مطلب ہے؟ اس سلسلے میں بزرگانِ دین کے بے شمار اقوال منقول ہیں جن میں گو تعبیر کا تھوڑا بہت اختلاف ضرور موجود ہے لیکن مفہوم و معنی کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے ہمارے بعض اساتذہ عبادت کی تعریف میں علامہ ابن قیم کی اس تشریح و توضیح کو بہت پسند فرماتے تھے جو انہوں نے مدارج السالکین جزو اول میں ان الفاظ سے فرمائی ہے

هي عبادة عن الاعتقاد والشعور بان للمعبود سلطة غيبية (في العلم والتصرف) يقتدر بها على النفع والضر فكل دعاء وثناء وتعظيم ينشأ من هذا الاعتقاد فهي عبادة۔

یعنی عبادت دعا و پکار اور تعظیم و ستائش کی ہر وہ شکل ہے جو اس شعور و اعتقاد کے ساتھ صادر ہو کہ معبود کو میرے اوپر ایک غائبانہ تسلط حاصل ہے جس کی بدولت وہ فوق الاسباب طریقے سے مجھے نفع اور ضرر پہنچا سکتا ہے۔

عبادت کے اس مفہوم کا ایک سرسری تجزیہ بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ معبود کی عظمت کا استحضار اور اُسی کے ساتھ خوف و محبت کا دائمی تعلق خاطر عبادت کے ہر عملی مظہر کا وہ محور و مدار ہے جس کے بغیر کوئی بھی عبادت رسم عبادت تو ہو سکتی ہے حقیقی عبادت ہرگز نہیں۔

حضرات گرامی! میں سمجھتا ہوں کہ تصوّف کی حقیقت و اہمیت کے بارے میں میں نے جو کچھ عرض کرنا ہے ان مختصر کلمات میں اس کا اجمال عرض کر چکا، لیکن میں اسی پر اکتفا ہرگز نہیں کروں گا اس لیے بھی کہ یہ مسئلہ ہماری انفرادی اور اجتماعی اصلاح کی ہر مہم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ کوئی بھی فرد یا جماعت تصوف کی روح کو اپنے اندر جذب کیے بغیر کسی مفید تبدیلی

© rasailojaraid.com

کی کوئی توقع نہیں رکھ سکتی، اور اس پہ یہ بھی کہ بعض متجددوں نے بیچارے تصوف کے خوف ناکردہ گناہوں کا ایک لمبا چوڑا فردِ جرم عائد کر دیا ہے، اور اسی کی بنیاد پر اس کو بدنام کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے۔

معزز سامعین! نفسِ معبود اور اس کی عبادت کا تصور تو فطرتِ انسانی کا وہ لازمی اندرونی داعیہ ہے جس سے وہ زمانے کے کسی دور میں بھی خالی نہیں رہا ہے۔ اختلاف جب اور جو کچھ رونما ہوا، اس قدرِ مشترک کے بعد معبود کی نوعیت کی تعیین اور اس کے طریقۂ بندگی کی تشخیص میں ہوا۔ اس کا مدعا یہ" كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط اور "كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه او ينصرانه او يمجسانه" جیسے قرآن و حدیث کے علاوہ ان لوگوں کی تحقیقات بھی شاہد ہیں جو ان مسائل پر سوچنے میں اپنی پوری عمریں یا کم از کم اس کا ایک معتدبہ حصہ صرف کر دیتے ہیں۔ علامہ شبلی نے الکلام میں مشہور محقق مکس مولر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہمارے اسلاف نے خدا کے سامنے اس وقت سر جھکایا تھا جب کہ وہ اس کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے۔ جسمانی خدا اس حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوئے کہ فطرت اصلی مثالی صورت کے پردے میں چھپ گئی۔

خدا کی تعیین اور طریقۂ بندگی کی تشخیص کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا گیا چنانچہ ان سب نے پہلی بات کے بارے میں تو یک زبان ہو کر یہی تعلیم دی کہ باری تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے اس سلسلے میں کوئی بھی اس کا ہم پایہ و ہم مرتبہ نہیں۔ البتہ دوسری بات کے بارے میں ان کی تعلیمات کہیں متوافق اور کہیں متضاد ہوئیں، اس توافق و تخالف کو سمجھنے کے لیے ادیانِ سماویہ کے اجزائے ترکیبی پر ایک نگاہ ڈالنی ضروری ہے تاکہ اس کے ہر ہر جزو کی مخصوص نوعیت معلوم ہو سکے۔ ہر دینِ سماوی اپنے ماننے والوں کے سامنے تین باتوں کی لازمی طور پر وضاحت کرتا ہے۔

۱۔ انسانی زندگی کی علمی بنیادیں کیا ہیں۔
۲۔ اس کی عملی صورتیں کیا ہیں۔
۳۔ اس علم و عمل کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کے طریقے اور تقاضے کیا ہیں۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

آسان اور مصطلح لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ ہر آسمانی دین بنیادی عقائد، شرعی اعمال اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ بنیادی عقائد میں توحید کے ساتھ نبوت و قیامت کی ضروری تفصیلات بھی آجاتی ہیں۔ شرعی اعمال میں عبادات و معاملات سے بحث ہوتی ہے۔ اور اخلاق کے عنوان سے اخلاص و ایثار اور ان دونوں کے نظری اور عملی لوازم کی تلقین کی جاتی ہے بنیادی عقائد کے بارے میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و رسل نے ایک جیسی تفصیلات بیان کیں، اس سلسلے میں ادیان سماویہ میں سرِ مُو برابر اختلاف نہیں رہا۔ شرعی اعمال میں ہر دین نے اس دور کے احوال و ظروف، اپنے دائرہ کار اور مخصوص مزاج کے مطابق راہِ عمل تجویز کیا۔ اخلاقی کلیات یعنی اخلاص و ایثار پہ تو تمام ادیان نے یکساں طور پہ زور دیا ہے۔

البتہ ان کی تعلیم میں کہیں کہیں تھوڑا بہت اختلاف رونما ہوا ہے، ادیان سماویہ کے اجزائے ترکیبی کے اس مثلث میں اجزائے ثلاثہ کی کیا نوعیت اور اہمیت ہے اس کو چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔

اگر دین کے مجموعے کو کسی ریل گاڑی سے تشبیہ دی جائے تو اس کے عقائد اس گاڑی کا وہ انجن ہوں گے جس کی قوت و حرکت سے پوری گاڑی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہے، شرعی اعمال کی حیثیت اس گاڑی کے ان ڈبوں کی ہے جن سے اس گاڑی کی ہیئت کذائی تشکیل پاتی ہے۔ اور اس کی اخلاقی قدریں بعینہٖ اُن آہنی زنجیروں کی طرح ہیں جو ڈبوں کو انجن سے مربوط رکھتی ہیں۔ دین اور اس کے اجزاء کو ہمارے نظام برقیات سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے دینی عقائد وہ بجلی گھر ہے جو برقی قوت پیدا کرتا ہے اعمالِ شرعیہ وہ برقی آلات ہیں جو ہمارے گھروں میں قسم قسم کے پنکھوں، قمقموں اور لاتعداد چھوٹی بڑی مشینوں کی صورت میں نصب ہیں، اور اخلاق وائرنگ کے وہ انتظامات ہیں جو برقی رو کو ان آلات میں پہنچاتے ہیں۔

دینی مجموعے کو ہم اُس جملے سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے ذریعے ہم اپنے مخاطب کو اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کرتے ہیں مثلاً زید عمر سے کہتا ہے کہ زمین گول ہے اس کلام میں زمین مبتدا، گول خبر، اور ہے رابطہ ہے تو عقائد مبتدا، اعمالِ شرعیہ خبر اور اخلاق اس مبتدا اور خبر کے درمیان رابطہ ہے۔

معزز سامعین! ان مثالوں پر غور فرمائیے۔ جیسے آہنی زنجیروں کے بغیر ریل گاڑی،

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

وائرنگ کے بغیر برقی نظام اور رابطہ کے بغیر جملہ عملی طور پر بالکل بے سود ہے اسی طرح سے اخلاق کے بغیر دین بے معنیٰ ہے کہ اسپر موعودہ دنیاوی اور اخروی نتائج میں سے کوئی نتیجہ بھی مرتب نہیں ہوتا۔

حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ اخلاص و ایثار کو اخلاق کے کلیات کا درجہ حاصل ہے۔ اسکے بعد خشیت و محبت، حضور و توجہ، رحم و رقت، رجوع و انابت، انکسار و تذلل، صبر و قناعت، اعتماد و توکل، شرم و حیا اور نصیحت و خیر خواہی اخلاص کے اور جود و سخا، حمیّت و شجاعت، عفت و پاکدامنی اور امانت و دیانت وغیرہ ایثار کے فروع ہیں۔

اخلاق کی اس تفصیل کے بعد میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اجزائے دین میں مختلف مثالوں کی مدد سے ہم نے اخلاق کا جو مرتبہ و مقام متعین کیا ہے وہ خالص فقہی نقطہ نظر سے ہے [illegible]، وقعت دی جاتی ہے نہیں تو زیادہ تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دین میں اخلاق کا مقام ایسا ہی ہے جیسے کہ بدن میں روح کا، چنانچہ جسطرح بدن کی ساری کارکردگی کا مدار روح پر ہے۔ اسی طرح سے بندگی کی پوری عمارت اخلاص و ایثار پر استوار ہے نبی علیہ السّلام کا ارشادِ گرامی ہے کہ "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ "کان خلقہ القرآن" چنانچہ معلوم ہوا کہ نبوت کا مقصدِ بعثت بھی تتمیم اور تکمیلِ اخلاق ہے اور قرآن کا موضوع بحث بھی اخلاق ہے۔ یاد رہے یہاں اخلاق کا اطلاق اس محدود معنی میں ہرگز نہیں ہے جسمیں فقط انسانوں ہی کے باہمی تعلقات کا ذکر ہوتا ہے بلکہ یہاں اخلاق سے وہ عام مفہوم مراد ہے جسمیں خالق و مخلوق دونوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر بحث ہوتی ہے۔

اخلاق عنوان ہے ان تمام تفصیلات کا جن کو قرآن حکیم میں تزکیہ اور حدیث میں احسان کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی علیہ السلام کے مقصدِ بعثت کے سلسلہ بیان میں قرآن مجید میں کئی دفعہ آپ کے جن فرائضِ منصبی کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس کی ترتیب سے تزکیہ کے مہتم بالشان ہونے پر کافی روشنی پڑتی ہے کلام فصیح کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس میں جب کسی ایک سلسلے کی متعدد چیزیں بیان کرنی مقصود ہوں تو ان کو ایک خاص ترتیب سے بیان کیا جاتا ہے اور اس ترتیب میں تقدیم و تاخیر کے مختلف

© rasailojaraid.com

وجوہ ہوا کرتے ہیں۔

نبی علیہ السلام کے فرائض منصبی کو سورہ بقرہ آیت ۱۲۹ میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ علاوہ ازیں سورہ بقرہ آیت ۱۵۱ سورہ آل عمران آیت ۱۶۴ اور سورۃ الجمعہ آیت ۲ میں انہی مقاصدِ اربعہ کو انہی الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے مگر اس تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کہ ان تینوں مقامات میں تزکیہ کو تعلیم کتاب وحکمت سے مقدم کیا گیا ہے، علمائے بیان کا کہنا ہے کہ اس تقدیم وتاخیر میں اس عظیم حقیقت پر آگاہی بخشی گئی ہے کہ چہارگانہ مقاصدِ نبوت میں سے تزکیہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ یہی مقصود بالذات اور اصلی غرض وغایت ہے اور کسی بھی کام کی غرض وغایت ذہنی اور فکری طور پر اس کام کے دوسرے تمام اجزاء سے مقدم اور وجودِ خارجی کے اعتبار سے ان سب سے مؤخر ہوتی ہے جیسے ہم کو بیٹھنے کے لیے کرسی کی ضرورت محسوس ہو جاتی ہے اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے ہم پہلے تو کرسی کے الگ الگ اجزاء اور پھر اس کے بنانے اور بیچنے والوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں چنانچہ متفرق اجزاء کو ایک خاص ترتیب سے مجتمع کرکے کرسی بنائی جاتی ہے اور پھر بیٹھنے کی غرض پوری ہوتی ہے۔

حضرات آپ نے دیکھ لیا کہ ذہنی طور پر تو کرسی کی غرض وغایت یعنی اس پر بیٹھنا تمام اجزاء پر مقدم تھا لیکن بالفعل بیٹھنا ان تمام اجزاء سے مؤخر ہے سورہ بقرہ کی پہلی آیت میں تزکیہ کو اس کے وجودِ خارجی کی رعایت سے تعلیم کتاب وحکمت کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اور بقیہ تین مقامات میں اس کی ذہنی اولیت کی بنا پر اس کو تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، بہرحال اس کا جملہ مقاصدِ نبوت کی غرض وغایت اور نتیجہ وثمرہ ہونا مسلم ہے جس سے قرآنی نقطۂ نظر سے تزکیہ کی بے مثال اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

کلام الٰہی میں کبھی کبھی ترتیب یوں بھی ہوتی ہے کہ مختلف اشیاء کو ایک خاص پہلو سے ادنیٰ سے اعلیٰ یا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف بالتدریج بیان کیا جاتا ہے مثلاً حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ میں ترتیب کو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف یوں چلایا گیا ہے کہ سب سے پہلے میتہ کا ذکر ہے جو محض اسلئے حرام ہے کہ اسمیں خون باقی رہ گیا ہے اگر یہ خون شرعی طریقہ سے نکالا جاتا تو گوشت پوست قطعاً

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.co

حرام نہ ہوتا۔ دوسرے نمبر پر اسی وجہ حرمت یعنی خون کا ذکر ہے جس کی حرمت لذاتہ ہے لہذا ظاہر ہے کہ پہلی قسم کی حرمت سے اشد ہے تاہم خون کی بعض قسمیں حلال بھی ہیں مثلاً جگر اور تلی، چنانچہ خون کی حرمت میں بھی فی الجملہ خفت پیدا ہو گئی تیسرے نمبر پر لحم الخنزیر کا ذکر ہے خنزیر پورے کا پورا نجس العین ہے اسی لیے اس کے تمام اجزائے بدن حرام قطعی ہیں اور اس کا پورا قسم کسی درجے میں بھی حلت کی حامل نہیں تو یہاں حرمت دوسرے درجے کی حرمت سے بھی اشد ہے جو تھے نمبر پر ... میں جن کی نجاست و نجاست کا یہ عالم ہے کہ روح انسانی کو براہ راست متاثر کرتی ہیں اور اس کو شرک کی آلائشوں سے آلودہ کرتی ہیں چنانچہ ان کی حرمت متذکرہ اوّل تمام درجوں سے شدید ترین ہے گویا کہ اس آیت میں حرمت کے پہلو سے ادنیٰ سے اعلیٰ یعنی خفت سے شدت کی طرف ترقی ہے۔ بالکل اسی انداز کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۹ ہے جہاں تزکیہ کو تعلیم کتاب و حکمت کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے۔ ذرائع ... نبوت کو سہل سے صعب اور آسان سے مشکل کی طرف ترقی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے چنانچہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تلاوت کتاب سے تعلیم کتاب اور تعلیم کتاب سے تعلیم حکمت مشکل ہے اور تزکیہ کا عمل تو ان سب سے بڑھ کر مشکل ہے کہ اس میں تعلیم کتاب و حکمت کی تمام تفصیلات کا عملی نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے جو بلاشبہ نرے وعظوں، تقریروں اور تحریروں سے بدرجہا جانگسل اور صبر آزما کام ہے اور شاید یہی چیز نبوت و رسالت کے لیے انتخاب انسانیت کی وجہ امتیاز ہے نہیں تو فقط تلاوت و تعلیم کے لیے تو فرشتے بھی کافی ہو سکتے تھے۔

قابل قدر سامعین! یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ تزکیہ سراسر عملی چیز ہے چنانچہ اس کی کوئی مہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے چلانے والے خود اس سے بوجہ اتم متصف نہ ہوں یہی تزکیہ احادیث میں احسان کہلاتا ہے حدیث جبریل میں ایمان و اسلام کے بعد اس کی حقیقت پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك کہ تو اللہ تعالیٰ کی ایسی بندگی کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اگر استحضار کا یہ بلند مقام حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو ہو کہ جیسے خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عبادت ایک عام مفہوم رکھتا ہے اور احسان اس کی ایک خاص شکل کو کہتے ہیں جس سے لازماً یہ نتیجہ بھی خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ بندگی و عبادت بلا احسان بھی ممکن ہے یہ ایک عظیم مغالطہ ہے جو ہمارے فقہی اصطلاحات سے پیدا ہوا ہے اسی لیے میں چاہتا

© rasailojaraid.com

ہوں کہ اس سلسلے کی چند توضیحات بھی سامعین کے گوش گزار کروں۔ تمام فقہائے کے سرخیل و سرتاج امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تعریف یوں فرمائی ہے۔ "معرفۃ النفس مالہا و ما علیہا" یعنی آدمی کا تمام منافع و مضرات کا سمجھ لینا فقہ ہے۔ فقہ کی اس جامع تعریف میں عقائد، اعمال اور اخلاق سب کے سب آجاتے ہیں لیکن بعد کے ادوار میں عقائد کے لیے کلام اور اخلاق کے لیے تصوف کے نام مخصوص ہوئے اور فقہ فقط اعمالِ ظاہری کا عنوان رہ گیا چنانچہ اس میں فقط بندگی کے ظاہری مظاہر سے بحث ہونے لگی۔ ان کی روح و حقیقت سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ یہی فقہ بالخصوص تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ایک معرکۃ الآرا فن بن گیا۔ دینداری سے بڑھ کر دنیاداری سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان بادشاہوں نے اسی فقہ ظاہری کی خوب خوب سرپرستی کی اور اپنے ہاں کے بڑے بڑے مناصب کو اسی کی بنیاد پر عطا کرنے لگے نتیجۃً علماء کی ایک بڑی اکثریت مناظرات اور مجادلات کا شکار ہو گئی جس کی بدولت دین کی اصل روح و حقیقت بُری طرح متاثر ہوئی اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر امام غزالیؒ نے فقہ کو علومِ آخرت کی فہرست سے نکال کر دنیادی علم قرار دیا۔

فقہ کا علومِ ظاہری میں محدود ہو کر رہ جانے کی دوسری فطری وجہ یہ ہوئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اللہ تعالیٰ نے معیت و رفاقتِ نبوت کی وجہ سے بڑی وسعت نگاہ اور توفیقِ عمل سے نوازا تھا۔ ان میں نبی علیہ السلام کی جامعیت اور ہمہ گیری کا رنگ نسبتاً غالب تھا وہ بیک وقت دین کے تمام شعبوں عقائد، اعمال اور اخلاق کے معلّم بھی تھے۔ اور حامل بھی، بعد کے قرون میں یہ جامعیت باقی نہیں رہی جہاں تک اپنی شخصی زندگی اور اعمال و اطوار کا تعلق ہے، مومنین صادقین ان تینوں پر یکساں طور پر کاربند رہے لیکن فطری قوتوں کی کمزوری اور اضمحلال کی وجہ سے ہر ایک نے اپنی طبعی مناسبتوں سے خدمتِ دین کے کسی ایک شعبے کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ اور اپنی پوری زندگی اسی میں کھپا دی۔

چاروں ائمہ فقہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی سیرتیں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے طور پر ان تینوں حصّوں کے کس درجے کے حامل تھے لیکن اس کے باوجود ان کی علمی خدمات فقہ ظاہری کے میدان میں ملیں گی، بعد کے زمانوں میں فقہاء کی ایسی قسمیں پیدا ہوئیں جنہوں نے ظاہر کو سب کچھ سمجھ لیا بلکہ اس سے بڑھ کر اہلِ باطن کی تنقیص کرنے لگے۔

ان توضیحات کے بعد آئیے اب حدیثِ جبرائیل کی اہمیت سمجھیئے اس سلسلے میں میں نبی علیہ السلام

© rasailojaraid.c

کی اس حدیث کا اردو ترجمہ پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں جو مشکوۃ کتاب العلم فصل اول میں آٹھویں نمبر پر نقل کی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ سب سے پہلا شخص جس کے بارے میں قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا ایک تو وہ شخص ہوگا جو شہید ہو گیا ہوگا پس اسکو حاضر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسکو اپنی نعمتیں یاد دلائیگا چنانچہ اس کو یاد آ جائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کے باوجود کیا کیا وہ کہے گا کہ میں نے قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہوا۔ باری تعالیٰ فرمائینگے کہ تو نے جھوٹ بولا تو نے تو اس لیے قتال کیا کہ تمہیں بہادر کہا جائے گا سو یہ تو کہا جا چکا اور اس کے علاوہ ایک وہ شخص ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن کو پڑھا اس کو پیش کیا جائے گا پھر اس کو اس کی نعمتیں یاد دلائی جائینگی وہ ان کو یاد کرے گا پھر باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور سکھلایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا۔ باری تعالیٰ فرمائینگے کہ تم نے جھوٹ بولا تم نے اپنے علم سیکھا تاکہ آپ کو عالم کہا جائے اور تم نے اس لیے قرآن پڑھا تاکہ تم کو قاری کہا جائے سو یہ تو کہا جا چکا پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا چنانچہ اسکو بھی منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈالدیا جائے گا اور ایک وہ شخص ہوگا جس کو رب تعالیٰ نے وسعت اور تونگری دی اور قسم قسم کے مال عطا فرمائے اس کو پیش کیا جائے گا پھر اس کو نعمتیں یاد دلائی جائینگی اس کو یاد آ جائیں گی ان سے باری تعالیٰ پوچھے گا کہ اس مال و دولت میں کیا کیا وہ کہے گا کہ ان تمام راستوں میں مال تیرے لیے خرچ کیا جس میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے۔ باری تعالیٰ ارشاد فرمائینگے تو نے جھوٹ کہا تم نے اسلیے خرچ کیا تاکہ لوگ کہیں کہ بڑا سخی ہے۔ سو یہ کہا جا چکا پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا چنانچہ اس کو اوندھے منہ آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

حضرات سامعین! یہ مکالمہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور ان لوگوں کے درمیان ہوگا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کو نہ صرف علمی طور پر جانتے ہیں بلکہ اعتقادی طور پر مانتے بھی ہیں۔ پھر احکام الٰہی پر ظاہری عمل بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے ان کے اعمال کی نفی ہرگز نہیں فرمائی اس کے باوجود ان کے یہ اعمال قبول نہ ہوئے کیوں کہ احسان کی روح سے خالی تھے۔ آج ہمارا اور آپ سب کا اپنے اور دوسروں کے بارے میں مشاہدہ ہے کہ علم و اعتقاد کے باوجود ہمارے اعمال کا قبلہ درست نہیں۔ علماء و قراء اور اہل دولت و

© rasailojaraid.com

ثروت کی زندگیاں تو سب کے سامنے ہیں لیکن جہاد کے نام سے لڑنے والوں کا تجربہ آپ میں سے اکثر کو نہ ہوگا۔

چنانچہ آپ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ کیا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر لڑنے والا بھی رضائے الٰہی کے علاوہ کسی دوسری غرض کے لیے بھی لڑ سکتا ہے؟ آپ کو اس استفسار پر میرا جواب سن کر یقیناً حیرت ہوگی لیکن مجھے کوئی حیرت نہیں۔ جہادِ افغانستان کے سلسلے میں اس حقیقت کا بار بار تجربہ ہوا ہے کئی لوگوں کو محض غضب کے طور پر روسی اسلحہ حاصل کرنے کے لیے اور بہت سوں کو بیرونی امداد میں حصہ داری بنانے کے لیے جہاد کا ڈھونگ رچاتے دیکھا ہے۔

مجھے بجا طور پر توقع ہے کہ اب تک کی گزارشات سے سامعین کے سامنے یہ بات عیاں ہو گئی ہوگی کہ جس چیز کو قرآن حکیم تزکیہ اور حدیثِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام احسان کے نام سے یاد کرتا ہے تصوّف بعینہٖ وہی چیز ہے۔ اصطلاحات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کونسی اچنبھے کی بات ہے۔ اب ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ دشمنانِ تصوّف کو تصوّف کے اس پاک اور قابلِ فخر شجرۂ نسب کا علم نہیں اسلئے اس کو بے اصل سمجھ کر بدعت قرار دے رہے ہیں یا قرآن و حدیث سے اس کے اس تعلق کو جانتے ہوئے اس کی مخالفت اور عداوت پر کمربستہ ہیں، دوسری صورت پہلی صورت سے بھی زیادہ قابلِ افسوس ہے لہذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

ان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ　　　وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

اب میں چاہتا ہوں کہ قرآن و حدیث اور تصوّف کے تعلق پر صوفیاء کے سرخیل حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا ایک قول پیش کروں تاکہ اگر کسی کو میرے بارے میں "مدعی سست، گواہ چست" کا تأثر پیدا ہوا ہو تو اس کا بھی ازالہ ہو جائے۔ سید الطائفہ حضرت جنیدؒ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ

"ہمارا یہ علم کتاب و سنت میں مقید ہے پس جو کتاب و سنت سے الگ ہو اس کی پیروی نہ کی جائے۔ یہی وہ علم صافی ہے جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہے یہ اس علم والے کو طریق عبودیت پر چلنے کے لیے ستون ہے۔"

بعض لوگ تصوف کے خلاف کھولے ہوئے اپنے محاذ کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم رحمہما اللہ تعالیٰ کا نام بھی بڑے شد و مد سے لیتے ہیں لیکن واضح رہے کہ ان بزرگوں نے نہ صرف یہ کہ صوفیاء اور ان کے کام کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ ان کے کام کو بہت اہم کام اور قرآن و حدیث کے عین مطابق بتلایا ہے امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔

"کتاب و سنت کا ہر معاملہ میں لحاظ اولیاء اللہ کے نزدیک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بکثرت اس کی ہدایت موجود ہیں" (الفرقان ص ۲۱ بحوالہ "تصوف کیا ہے۔")

حافظ ابن قیمؒ تو دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ۔

"طریق کتاب و سنت کی تقیید ہے"

اور شیوخ عارفین کا اجماع نقل کرتے ہیں۔

"تصوف قرآن و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں۔"

اور بطور سند کے حضرات جنیدؒ، ابوحفصؒ، ابوسلیمان دارانیؒ، سہل بن عبداللہؒ، سریؒ، ابویزیدؒ، احمد بن ابی الحواریؒ، ابوعثمان نیشاپوریؒ، ابوالحسن نوریؒ، محمد بن فضلؒ، عمرو بن عثمان مکیؒ، ابوسعید خرازؒ، ابن عطاؒ اور ان جیسے بے شمار دوسرے بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے ہیں۔

حضرات! تصوف کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد مجھے اس سلسلے کی ان لفظی مناقشات سے کوئی دلچسپی باقی نہیں جو اس کے مبدأ و مأخذ کے بارے میں روا رکھے جاتے ہیں کہ یہ لفظ "صوف" سے ماخوذ ہے یا "صفا" سے اور "صفو" سے نکلا ہو یا "صفت" سے اور یا پھر یہ یونانی لفظ صوفیاء سے لیا گیا ہو جس کے معنی حکمت کے بتائے جاتے ہیں، اس سے اس کی ماہیت و معنویت پر کوئی فرق نہیں آتا۔ لہذا اس پر اپنی گویائی اور آپ لوگوں کی سماعت خرچ کیے بغیر تصوف کے سلسلے میں ایک دوسری بحث کی طرف منتقل ہوتا ہوں۔

یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ تصوف قرآن و حدیث سے الگ کوئی چیز ہرگز نہیں ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی ذات پر یقین پیدا کرنے کا نام ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ یقین خدا تعالیٰ کے پیغمبر اور اس کے صحابہ سے بڑھ کر کس کو حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نبی علیہ السلام اور اس کے صحابہؓ کو ان اشغال و اوراد میں مصروف نہیں دیکھتے ہیں جو صوفیاء کے ہاں رائج ہیں اگر تصوف کے بارے میں یہ دعوی واقعۃً صحیح ہے کہ وہ سنت ہی میں مقید ہے تو دونوں کے درمیان یہ واضح فرق کیوں موجود ہے۔ دین میں ذات حق کے یقین اور اس کی عظمت و کبریائی کے ہر دم دھیان و استحضار کی اہمیت و مقصودیت کا اندازہ ہو جانے کے بعد اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تشویش کا ازالہ چنداں مشکل نہیں خود نبی علیہ السلام کی حالت شریفہ تو یہ تھی کہ نیند میں بھی اگرچہ آنکھیں سو جاتیں لیکن قلب مبارک مشتغل باللہ اور مصروف مناجات ہوتا، حیات طیبہ کا کوئی لمحہ دھیان اور توجہ و استحضار سے خالی نہ ہوتا تا آنکہ انسانی حاجت کے وقت جو تھوڑا سا انقطاع ہو جاتا اس پر بھی فراغت کے بعد "غفرانک" فرما کر سراپا التجا ہو جاتے، آپ کی صحبت و رفاقت کی برکت سے قریب قریب یہی کیفیت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بھی پیدا ہو گئی تھی، قرآنی آیت "رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" کے بعد اس مدعا پر کسی دوسری دلیل کی ضرورت باقی نہیں۔ نبوت اور اسکی صحبت یافتہ جماعت صحابہ کا دور گزر جانے کے بعد دین کی اس مطلوبہ کیفیت کو پیدا کرنے اور باقی رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ ذکر و فکر کا اہتمام کیا جائے۔

علمائے کرام عظام نے ہر شخص کے لیے زندگی کے شب و روز میں ذکر و فکر کی خلوتوں کو بھی اس وقت تک نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا جب تک کہ حضور و استحضار کا ضروری ملکہ پیدا نہ ہو اس سلسلے میں بعض بندگان خدا کو اپنے ذاتی تجربات سے معلوم ہوا کہ ذکر و فکر کے بعض طریقے بعض دوسرے طریقوں کی بہ نسبت زیادہ انفع فی المقصود ہیں چنانچہ انہوں نے انکی باقاعدہ ترتیب و تدوین کے بعد اپنے متعلقین اور ان کی وساطت سے متعلقین متعلقین کو بھی تعلیم و تلقین شروع کر دی جس سے تصوف کے مختلف مسالک وجود میں آئے تاہم ان سب کا دو باتوں پر ہمیشہ کے لیے اجماع رہا پہلی بات یہ کہ مقصود بالذات حضوری یا ان کی مخصوص اصطلاح میں "نسبت" حاصل کرنی ہے ہمارے صوفیانہ اشغال محض ذرائع اور وسائل ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں اور دوسری بات یہ کہ متذکرہ مقصد کا حصول انہی ذرائع میں بند نہیں بلکہ اسکے لیے ہمارے تجویز کردہ طریقوں کے علاوہ اور بھی متعدد طریقے ہو سکتے ہیں، ان دونوں باتوں کے ضمن میں محققین اہل طریق کے چند اقوال ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ "ایضاح الحق الصریح" میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت، دوا و معالجہ کی ہے کہ بوقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو"

اور "صراط مستقیم" میں فرماتے ہیں۔

"ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں اس لیے ہر طریق کے محققین تجدید اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں"

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"ذکر کے نور کا ملاحظہ جو ابتدا میں تلقین ہوتا ہے وہ مقصدِ اصلی نہیں بلکہ تمہید ہوتا ہے۔"

"پاسِ انفاس وغیرہ سب حیلے اس کے ہیں کہ ذکر مخیلہ میں قائم ہو جائے ورنہ اصل مقصود نہیں جب خیالِ ذکرِ ذات قائم ہو جائے تو زبان اور انفاس کسی کی ضرورت نہیں۔"

حضرت شاہ ولی اللہؒ القول الجمیل میں فرماتے ہیں

"یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی ہے۔"

اور انہی صوفیانہ حلقوں کی یہ بہت مشہور و معروف کہاوت ہے کہ

"طرق الوصول بقدر عدد الانفاس"، یعنی حصولِ مقصد کے ذرائع تو کثرت میں سانسوں کے ہم عدد ہیں"

خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ مروجہ تصوف ذکر و فکر کے چند مخصوص طریقوں کا نام ہے۔ ذکر و فکر کی اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں کہ ولذکر اللہ اکبر، افلا یتدبرون القرآن، لعلہم یتفکرون اور انا مع عبدی اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاہ، لکل شئ صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ وما من شئ انجیٰ من عذاب اللہ من ذکر اللہ وغیرہ بکثرت آیات و احادیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ البتہ اس کے مخصوص طریقوں میں کلام کی گنجائش ہے۔ مگر یہ گنجائش اس وقت بالکل ختم ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ذکر و فکر کے علاوہ بھی اکثر دینی مقاصد کے ذریعہ حصول اور طریقِ کار میں مرورِ زمانہ کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور علمائے امت نے نہ صرف ان کو مستحسن سمجھا ہے بلکہ ناگزیر بنایا ہے مثلاً دین سیکھنے اور سکھانے کا دین میں بہت اونچا مقام ہے نبی علیہ السلام اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں اس کے لئے فقط صحبت کافی ہو جایا کرتی تھی اس کا کوئی مستقل انتظام ہرگز نہیں تھا لیکن بعد میں ایسے حالات ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کے لیے کافی نہیں رہی بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے۔ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں قرآن پاک کے مختلف حصے مختلف صحابہ کے پاس متفرق طور پر موجود تھے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے دورِ خلافت میں اس کی جمع و تدوین کی گئی اور پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اس کے اختلافِ قرأت کو بھی ختم کر کے ایک مخصوص رسم الخط سے یک حرفی بنایا گیا یہ اور اس قسم کی اور کئی تبدیلیاں امت میں واقع ہوئیں۔

© rasailojaraid.c

مگرچوں کہ یہ ایک ضروری مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وسائل کی وہ تبدیلیاں تھیں جو تبدیلیٔ زمانہ کی وجہ سے ضروری قرار پاگئی تھیں اسلئے کسی طرف سے بھی اس پر نکیر نہ ہوا۔ تو ذکر و فکر کے وسائل میں اس ضروری تبدیلی پر برہمی کی کیا وجہ جواز ہوسکتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ تصوّف علمی طور پر الحاد و بدعقیدگی اور عملی طور پر تعطّل پیدا کرتا ہے، اس سلسلے میں یہ عرض کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ جیسے کہ فی زمانہ ہمارے ہر شعبۂ حیات پر نااہلوں کا قبضہ ہے، تصوف کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں علم و فقاہت ہو، طب و حکمت ہو یا سلوک و معرفت ہو، ہر جگہ "زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن" کی صورت حال ہے لہذا جیسے درباری مولویوں کی وجہ سے علم و فضل اور اشتہاری طبیبوں کی وجہ سے طب و حکمت کی ناقدری کرنی انتہائی ناانصافی ہوگی اسیطرح سے سبز پوشش مزار نشینوں اور آہن بردار ملنگوں کی وجہ سے تصوّف کو کوسنا کسی صحیح العقل انسان کا کام ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح سے حقیقی زہد و تقویٰ کے حامل اپنے نامدار آبا و اجداد کی بوسیدہ ہڈیاں بیچنے والے، اور ان کے وابستگان و متعلقین کی دولتوں اور عصمتوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے عیار و مکار پیروں اور پیرزادوں کی عیاشیاں اور بدمعاشیاں بھی تصوف کی طرف منسوب کرنا وہ بھونڈی حرکت ہوگی جس پر کوئی بھی سنجیدہ آدمی تکلیف محسوس کیے بغیر نہیں رہے گا۔ اس جملہ معترضہ کے بعد اب اصل اعتراضات کا جواب سُن لیجئے۔

(جاری ہے)

(بقیہ درجۂ حکمت)

فجئت فختمت الانبیاء[1] میں آیا اور میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کردیا

اس مضمون کی اور بہت سی حدیثیں مختلف حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ رنبوت و ختم نبوت کی مزید تفصیل کے لئے راقم کی کتاب "حدیث کا درایتی معیار" دیکھنی چاہیئے۔

(جاری ہے)

---

[1] مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب خاتم النبیین،

© rasailojaraid.c